تفہیم معانی قرآن اوراصول تأ ویل

(التکمیل فی اصول التاویل ازفراھی کا خصوصی مطالعہ)

*محمد فاروق حیدر

Abstract

Many schools of thought emerged with regard to understanding glorious Qur'an in the subcontinent. One of those is founded by Hamid al-Din Farahi who made Quran the centre of his research and investigation. He based his Quranic Thought on Coherence in the Qur'an and presented Coherence as the major principle of Taweel. His book Al-Takmil fi Usul al-Tawil (Perfection in the Principles of Interpretation) is of tremendous importance in this regard.in which Farahi comprehensively explained the basic Principles of Interpretation .These are the Principles on the basis of which he spelt out various modes of understanding the meaning of the Qur'an. But the fact of the matter is, by making coherence a Fundamental Principle, he opted for a deviant attitude in the field of exegesis which led to ignoring even the most authentic Narratives.

برصغیر میں قرآن مجید کے ترجمہ،تفسیر اور اصولِ تفسیر کی جس روایت کا آغاز شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ نے کیا ہنوز جاری ہے۔ برصغیر میں روایتی طرز سے ہٹ کر فہمِ قرآن کے حوالے سے کئی دبستان جلوہ گر ہوئے جن میں سے ایک دبستان کے بانی مولانا حمید الدّین فراھی [1] ہیں جنہوں نے قرآن مجید کو اپنی تحقیق وجستجو کا مرکز بنایا اور نظمِ قرآن کو فہمِ قرآن کی بنیاد بنا کر اپنی فکری عمارت تعمیر کی۔ علامہ فراھی کو علوم القرآن میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ اس فن پر آپ کی کئی تالیفات آپکی اس خصوصیت کی آئینہ دار ہیں۔ اس حوالے سے آپکی ایک اہم کتاب ''التکمیل فی اصول التاویل'' ہے۔ جس میں علامہ موصوف نے اصول تأ ویل کی معنویت، غایت اور مرکزیت بیان فرما کر ان کی روشنی

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، جی۔سی یونیورسٹی لاہور

میں قرآن مجید کے مرادی معانی کی تفہیم کے مختلف طُرق کی وضاحت فرمائی۔تأ ویل کے یہ اصول اور تفھیم قرآن کے مختلف طُرق علامہ فراھی کے قرآن مجید میں گہرے تدّ بر وتفکّر کا نتیجہ ہیں۔نظمِ قرآن کو مرکزی اصولِ تأ ویل کے طور پر پیش کرنا فراھی صاحب ہی کا خاصہ ہے جبکہ نظمِ قرآن میں اخفاء کے اسباب اور تفہیمِ معانی کے مختلف طُرق کلی یا جزئی حیثیت میں کُتبِ اصول اور کُتبِ علوم القرآن میں شرح وبسط کے ساتھ مختلف انداز سے زیر بحث آ چکے ہیں۔ علامہ فراھی نے قرآنیات پر جو کتب تالیف کیں ان میں تین اھم کتب بالترتیب دلائل النظام، اسالیب القرآن اور التکمیل فی اصول التاویل کو یکجا ''رسائل الامام الفراھی فی علوم القرآن'' کے عنوان سے شائع کیا گیا۔اِن تینوں کتابوں میں علم تفسیرِ قرآن کے اھم مباحث کو جمع کیا گیا ہے۔کتاب التکمیل فی اصول التاویل اس حوالہ سے نہایت اہم کتاب ہے جس میں علامہ نے تفسیر قرآن کے اصول ومبادیات کو بیان کیا ہے۔جن کی روشنی میں معانی قرآن کی تفھیم کے مختلف طرق کی وضاحت فرمائی۔

علامہ فراھی کے نزدیک تاویل کو نظام سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے اسی لئے انہوں نے لکھا ہے:

التاويل لا يمكن فصله من النظام فانهما مخلوطان وانما اردت اولا بيان النظام فاضطرني الى التاويل ثم وجدت فيه خيرًا كثيرًا، فان به يكشف عن معنى القرآن و يبطل الاضاليل، فساقني الجدول الى عباب البحر۔ ۲

نظم قرآن کی طرح تاویل کا علم جاننا بھی بہت ضروری ہے۔یہ علم معانی قرآن کی معرفت میں رھنمائی کرتا ہے۔

علامہ نے اپنی دوسری کتاب ''احكام الاصول باحكام الرسول'' سے ممیّز کرتے ہوئے کتاب التکمیل کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں قرآن اور عقل صریح سے ماخوذ دلائل کی روشنی میں فہم کلام اور اس کی تاویل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

ان هذا مختص بالدلائل المأخوذة من القرآن وصريح العقل، ولا يبحث الا عن ما يتعلق بفهم معنى الكلام و تاويله۔ ۳

یہ کتاب نظام القرآن کے مقدمہ کے طور پر لکھی گئی ہے اور خصوصیت کے ساتھ اصول تأ ویل بیان کیے گئے ہیں جو معانی قرآن کے تعین میں رہنمائی کرتے ہیں۔کتاب کے آغاز میں آپ نے اِس علم کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔

اما بعد فهذا كتاب من مقدمة نظام القرآن، افردناه لتمهيد اصول راسخة لتاويل القرآن الى صحيح معناه، وهو علم مستقل عظيم المحل فى التفسير فانه يدلك علـى الـمـعـنـى المراد من كتاب الله، ومع ذلك هو فن عام، فان قواعد التاويل تـجـرى فى كل كلام، ولكن النفع الاعظم منه فهم كتاب الله و معرفة محاسنه للاعتصام بما هدى الله النفوس به الى غاية كمالها۔ ۴

بقول علامہ فراہی انہوں نے اس کتاب میں اس فن کو مکمل کیا ہے جو پہلے ادھورا تھا۔ اصول فقہ کے ضمن میں تاویل قرآن کے بعض اصول شامل تو تھے لیکن نامکمل ہونے کے باعث کتاب اللہ کے فہم کے لئے ناکافی تھے اس غرض سے آپ نے اس علم کو مکمل کیا اور اسی مناسبت سے کتاب کا نام ''التكميل فى اصول التاويل ''رکھا۔۵ کتاب کے آغاز میں ہی علامہ فراہی نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ علم اصول تأویل اس بات کا حقدار تھا کہ کتاب اللہ کے فہم کے لئے ایک مستقل فن کی حیثیت میں سامنے آتا لیکن اسے صرف اصول فقہ کے جزء کی حیثیت مل سکی۔ لہٰذا ایک غیر مستقل فن ہونے کے باعث اسے وہ توجہ اور اہمیت نہ مل سکی جو بحیثیت مستقل فن اس کو ملنی چاہیے تھی اصول فقہ کا ایک جزء بن جانے کی وجہ سے تین اعتبار سے اس علم نے اپنا مقام کھودیا۔

i۔ الا ولى انه كان حريا بالبحث المستقل، فصار له شركاء فصار مغموراً فيها۔

ii۔ والثـانية انـه كان معظم علم التفسير لكونه اصولا لفهم القرآن، واذا جعل من علم الفروع لـم يبالغ فى تنقيحه حتى يصير لعلم التأويل كالمعيار والميزان مثل علم النحو والعروض۔ فـمـا بـلـغ مبـلـغ الـفن المنقح بل كان قصاراه أن يكون اصولا شخصية مثل قوانين الأمم المختلفة فيقال ان ابا حنيفة جرى على هذه الاصول، والشّافعى على تلك۔

iii۔ والثـالثة أن القرآن ليس مقصورا على الفروع بل معظمه يتعلق بالعقائدِ وبواطن الاخلاق۔ واذا جعل من اصول الفقهِ صار مقصورا عليه، ومن هذه الجهة خاصّة وقع خلل فاحش فى بناء العلم الذى يهدى اِلى فهمِ القرآن۔ ۶

علامہ فراہی نے اصول تاویل کو اصول فقہ میں جزوی حیثیت ملنے پر اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ دیگر علوم دینیہ جیسے علم اخلاق ومواعظ اور علم الکلام کا بھی قرآن سے کوئی تعلق نہ رہا اور یہی سبب ہوا کہ ان علوم میں بھی مسلمان کوئی کمال پیدا نہ کر سکے۔ علامہ فراہی کے نزدیک علوم دینیہ میں اتنا بڑا خلا صرف اس وجہ سے رہ گیا کہ

مسلمان اتنی صدیوں سے ایسے اصول تاویل کی بنیاد نہ رکھ سکے جن کی کارفرمائی دیگر علوم میں بھی تھی۔اس بحث کے آخر میں رقمطراز ہیں:

فأن جعلت القرآن اصلاً لتمامِ علم الدّین کما ھو فی الحقیقۃِ، صارَمِنَ الواجبِ أن یوسس أصول للتاویل، بحیث تکون علماً عاماً لکل مایُوخذمِنَ القرآنِ۔ ۷

قرآن مجید علوم دینیہ میں اصل کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس بات کا تقاضا ہے کہ قرآن مجید کی تاویل کے اصولوں کی بنیاد رکھی جائے۔ جو قرآن سے ماخوذ ہر علم کے لیے معیار ہو۔

علامہ فراہی کے اصول تاویل:

علامہ فراہی اپنی کتاب التکمیل کا مقصد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

غـایۃ ھذاالکتاب ھی معرفۃ الاصول التی تعین علی فھم القرآن الحکیم حسب افھـام البشـر۔وھـذہ الاصـول تنقسم علی قسمین: الاول مایعصم عن الزیغ فی التـاویل۔ والثانی ما یھدی الی الحکم التی یتضمنھا کتاب اللہ۔ والا مرالجامع لھـذیـن ھـو التـفـکـر فی نظم القرآن۔ فالنظم ھوالحبل المتین الذی یعصم من یـعتـصـم بہ عن الزیغ وھو السراج المنیر الذی یدل الی الحکم فان الا یات انما تنتظم بما تتضمن من الحکمۃ فانھا ھی الجامعۃ۔ ۸

کتاب کی غرض و غایت ایسے اصولوں کی پہچان ہے جو حسب انسانی فہم قرآن مجید کے معانی کا تعین کرتے ہیں۔اس اصول کی دو قسمیں ہیں ایک اصول وہ ہیں جو تاویل میں گمراہی سے محفوظ رکھتے ہیں اور دوسرے اصول وہ ہیں جو ان حکمتوں کے طرف رہنمائی کرتے ہیں جن پر قرآن مشتمل ہوتا ہے۔ان دونوں قسموں کیلئے جامع امر صرف نظم قرآن میں تفکر ہے۔نظم ہی وہ مضبوط رسی ہے جس کو پکڑ کر ایک شخص کجروی سے محفوظ رہتا ہے۔ یہ نظم ہی وہ روشن چراغ ہے جو حکمتوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے کیونکہ آیات نظم میں آ کر ہی حکمت کی حامل ہوتی ہیں۔

اصول تأویل کی غرض و غایت فہم قرآن میں ہر قسم کی گمراہی سے محفوظ رکھنا ہے اور ایسا اُسی وقت ممکن ہے جب نظم قرآن کو دریافت کیا جائے گا۔لہذا یہاں نظم کی حقیقت جاننے کے لئے فراہی صاحب کی مختلف کتب سے اقتباسات درج ذیل ہیں:

قرآن مجید اپنے مرتب و منظّم ہونے پر کئی پہلوؤں سے دلیل فراہم کرتا ہے۔ایک آیت کئی مضامین کو جمع

کئے ہوئے ہوتی ہے اور کبھی متعدد جملوں پر بھی مشتمل ہوتی ہے۔ لیکن ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اِس آیت کے غیر منظّم ہونے کا گمان بھی کرے۔ ذرا سے غور کے بعد اس کا نظام سمجھ میں آجاتا ہے جو آیات کے مجموعوں کا نظام سمجھنے کے لئے مثال اور نمونہ کا کام دیتا ہے۔ آیات کے مجموعوں کا یہ نظام سورۃ کے طویل حصوں کے نظام کو سمجھنے کے لئے مثال فراہم کرتا اور پوری سورۃ کے نظام تک رسائی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایک آیت یا آیتوں کے مجموعوں کے نظام ہی کے مشابہ سورتوں کا آپس میں نظام بھی ہے۔ لھذا جو شخص ایک آیت کے اندر نظم کا اقرار کرتا ہے جس کے مانے بغیر کوئی چارہ نہیں تو اس کے لئے اس کے سوا بھی کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ آیات کے مجموعوں اور پھر سورتوں کے نظم اور ان کے باہمی ربط کا اقرار کرے۔ کیونکہ انکے ربط کی نوعیت ایک جیسی ہے۔[9]

علاوہ ازیں مضامین کی باہمی مناسبت بھی نظم کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

قرآن مجید کے ایک مقام پر مضامین میں جو ربط نظر آتا ہے وہ کئی دوسرے مقامات پر بھی ملحوظ ہوتا ہے۔ جب تم اس ربط کی مناسبت پر غور کروگے تو اس کی حکمت تک پہنچ جاؤ گے۔ مثال کے طور پر قرآن میں بار بار نماز کے ساتھ زکوۃ کا۔ ربوٰ کے ساتھ صدقہ کا، مالی قربانی کے ساتھ جانی قربانی اور نماز کا صبر کے ساتھ نماز کا جہاد کے ساتھ ہوائے نفس سے اجتناب کا نماز کے ساتھ سخاوت اور قربانی کا تقوی کے ساتھ ایمان، احکام شریعت اور قسط کا۔ اور قسط کے ساتھ توحید، معاد اور احکام شریعت کا مضمون دیکھو گے۔ غور کرنے سے ان مضامین کی باہمی مناسبت سمجھ میں آجاتی ہے اور کہیں کہیں تو اس مناسبت کو واضح بھی کر دیا گیا ہے۔ یہ چیز نظام کی طرف رہنمائی تو کرتی ہی ہے اس کے علاوہ یہ حکمت کے ابواب تک بھی رہنمائی کرتی ہے کیونکہ حکمت نظام کے ساتھ پیوست ہے۔[10]

نظام وہی قابل قبول ہوسکتا ہے جو پوری سورۃ کو ایک وحدت عطا کرے اور اس کے تمام اجزاء ایک خاص مرکزی مضمون، جس کو ہم عمود کہیں گے سے مربوط ہو جائیں۔ لہذا نظم کے متلاشی کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ کلام کے سیاق پر غور کرے۔ ہر سورۃ میں مختلف مطالب ہوتے ہیں یہ متعین نہیں ہو پاتا کہ یہ مطالب کس عمود کی طرف لے جارہے ہیں جب تک کلام کے سیاق وسباق کو نہ سمجھا جائے اس کے مختلف حصوں کا باہمی تعلق سمجھ میں نہیں آتا لہذا یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ پہلو جان لئے جائیں جو ان مختلف حصوں کو ایک لڑی میں پرودیں۔ فی الجملہ کلام کا نظام ہی سورۃ کو وحدانیت عطا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ ایک کامل و مستقل بالذات وحدت بنتی ہے جس کا ایک عمود ہوتا ہے اور جس کی طرف اس کے تمام اجزاء پلٹتے ہیں۔ [11]

بعض سورتوں کے نظام کی تاویل کئی شکلوں میں کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ البتہ اصل مشکل اس بات

کے تعین میں پیش آتی ہے کہ صحیح مقصود نظام کونسا ہے جو کلام میں ایک وحدت پیدا کر دے۔ ۱۲؎

تأویل کا بیشتر اختلاف نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں نے آیات کے اندر نظم کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اگر نظم کلام ظاہر ہوتا اور سورۃ کا عمود یعنی مرکزی مضمون واضح طور پر سب کے سامنے ہوتا تو تأویل میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوتا۔ ۱۳؎

میرے نزدیک سب سے زیادہ بے خطر راہ یہ ہے کہ استنباط کی باگ قرآن مجید کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ اس کا نظم و سیاق جس طرف اشارہ کرے اسی طرف چلنا چاہیے۔ ۱۴؎

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فہم قرآن میں نظم قرآن کی اہمیت کلیدی ہے۔ تمام تر تاویلات کا اختلاف نظم قرآن کا لحاظ نہ رکھنے کی وجہ سے ہے اگر نظم و سیاق کی روشنی میں سورت کا عمود معلوم کر کے قرآن کے معانی کا تعین کیا جائے تو تاویل کا اختلاف ختم ہو جائے اس ضمن میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ بعض سورتوں کے نظام کی تاویل کئی شکلوں میں کرنے کی گنجائش موجود ہوتی ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فراہی صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا مفسر اور محقق تدبر و تفکر سے کوئی نظام بھی متعین کر سکتا ہے لہٰذا نظام کو بنیاد بنانے کے باوجود ایک سے زیادہ تاویلات کے امکان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اصول تاویل کی اہمیت بیان کرتے ہوئے آپ نے واضح کیا ہے کہ اس بات کی شدت سے ضرورت ہے کہ اصول تاویل کی بنیاد رکھی جائے اور ان کو مضبوط بنیادوں پر اٹھایا جائے۔ مسلمانوں کا ہر فرقہ قرآن کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ ہے لیکن آیات قرانیہ کی تاویل اپنی رائے سے کرتا ہے یہاں تک کہ اہل ایمان نے یہ گمان کرتے ہوئے سنت کو مضبوطی سے تھام لیا کہ قرآن تو کئی وجوہ کا حامل ہے جبکہ سنت واضح ہے۔ حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ قرآن محفوظ اور مضبوطی سے پکڑنے کیلئے قابل اعتماد تھا۔ باطل طبقہ نے اس کے مفاھیم کو اصل سے پھیر دیا۔ ۱۵؎

قرآن کو اصل بنا کر آپ نے جو اصول تاویل وضع کئے۔ انکے بیان سے پہلے اپنے اصولوں کی افادیت سے متعلق آپ نے لکھا ہے:

> فلو اوضحت اصول التاويل لم يمكنهم التحريف واليأس من القرآن والتمسك بالاحاديث و هن وفتح لا بواب الا كاذيب ولا يتم الحجة عليهم فليعتصم بالقرآن وبنظمه و يشيده بالسنة والخبر الصحيح والعقل الصريح۔ ۱۶؎

یہاں فراہی صاحب نے اس بات کی وضاحت کی کہ میرے اصول تاویل ایسے ہوں گے جو قرآن مجید

کے صحیح معانی کا تعین کریں گے اور ان اصولوں کی موجودگی میں کسی کیلئے کلام اللہ میں تحریف کرنا ممکن نہ ھوگا اور نہ ھی قرآن سے کوئی مایوسی ھوگی۔ اور احادیث کی مدد سے جھوٹی تاویلات کے دروازے بند ہو جائیں گے اس لئے ضروری ہے کہ قرآن اور اسکے نظم کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے اور سنت، خبر صحیح اور عقل صریح سے قرآن اور اسکے نظم کی تائید کی جائے۔ علامہ فراھی نے تاویل قرآن کے اصولوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان اصولوں کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے:

الا صول ثلاثة: (۱) اصول أولية۔ (۲) واصول مرجحة۔ (۳) واصول كاذبة اعتمدوا عليها وليست بشى، انما نذكرها للاجتناب عنها۔

فاالا صول الاولية: مايتمسك به حيث لا احتمال لمعان شتى۔

والا صول المرجحة: يتمسك بها اذا احتمل الكلام معانى مختلفة۔ فاذا اعملنا الا صول المرجحة اخذنا ما هوا لراجح و تركنا المرجوح۔ [۱۷]

فراھی صاحب نے اصول تاویل کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے اصول وہ ہیں جو بنیادی ہیں دوسرے ترجیحی ہیں جبکہ تیسرے باطل اصول ہیں۔

ا۔ بنیادی اصول:

قرآن مجید کی تاویل کا پہلا اصول چار نکات پر مشتمل ہے:

(i) نظم کلام اور سیاق کا لحاظ: [۱۸]

قرآن مجید کی تاویل نظم اور اسکے سیاق کو مدنظر رکھتے ہوئے کی جائے گی۔ اور جو تاویل اس نظم کے خلاف ہوگی وہ قابل قبول نہیں ہوگی جیسے آیت تطہیر [۱۹] کی تاویل کی مثال ہے اس آیت کا نزول امھات المومنین کے حق میں ہوا اسکے علاوہ اس آیت کا تعلق کسی اور سے نہیں اور نہ ھی اس میں کوئی اور داخل ہے کیونکہ کلام اس کی تعمیم کا محتمل نہیں ہے۔ [۲۰]

(ii) شاذ معنی کی طرف عدم التفات:

علامہ فراھی اس کو مرجح اصول میں شمار نہیں کرتے کیونکہ کبھی عام ظاہر لفظ کی بجائے کوئی اچھا محفوظ لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے لیکن ایسا لفظ جب استعمال کیا جائے تو ضروری ہے کہ وہ اپنے معلوم و ثابت مفہوم پر دلالت کرتا

ہوا گر ایسے لفظ سے وہ مفہوم لیا جائے جسے لوگ نہ جانتے ہوں جبکہ مدعی اسکا دعویٰ کرتا ہو اور اسکو ثابت کرنے میں اسکے پاس کوئی دلیل بھی نہ ہو تو یہ ایک ایک پیچیدہ مسئلہ بن جائے گا۔ جبکہ قرآن مجید کو اللہ نے عربی مبین میں نازل فرمایا تو وضاحت کو کیوں چھوڑا جائے۔ جہاں تک معاملہ ہے مطالب عالیہ کا تو وہ اس باب سے نہیں ہیں کیونکہ ان میں کلام اپنے مفہوم میں واضح ہوتا ہے اور یہ مطالب عالیہ ان الفاظ میں ہوتے ہیں جن میں نہ کوئی تضاد ہوتا ہے اور نہ تناقض۔ ۲۱

قرآن مجید سے اس کی دو امثلہ درج ذیل ہیں:

(اِنْ تَتُوْبَا اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا) ۲۲

اہل باطل نے الصغو کے معنی پھیر کر زیغ کا مفہوم لینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے اپنی باطل تاویل کیلئے ایک جھوٹی قراءت گھڑی جسے قراءت متواتر کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ ۲۳

(فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْکَ بِبَدَنِکَ) ۲۴

یہاں بدنک کا معنی بدرعک سے کرنا درست نہیں کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں کہ یہاں بدن کی بجائے زرہ کی طرف ذہن منتقل ہو ویسے بھی آدمی اپنے جسم و شکل سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ اپنی زرہ سے۔ ۲۵

(iii) فہم کلام کیلئے اس کے بعض حصوں کا بعض سے تقابل اور نظیر پر نظیر کا اطلاق۔

یہی وہ اصول ہے جس میں قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ ۲۶

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر جہاں کہیں اجمال ہوتا ہے اس کی وضاحت کسی دوسرے مقام پر کر دی جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ نفس کلام سے ہی معانی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ ۲۷ اس اصول کی وضاحت میں علامہ فراہی نے قرآن سے امثلہ نقل کی ہیں:

فی اواخر سورة الانفال جاء ((اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ۲۸ و بعيد ذلك جاء؛ ((وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) ۲۹ فلم يذكر بأموالهم وانفسهم وهو مفهوم۔ ثم جاء بعيد ذلك : ((وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا مَعَكُمْ))، فلم يذكر فی سبيل الله و لا بأموالهم وانفسهم ولكن ذلك مفهوم وقد دل عليه (معكم)۔ ۳۰، ۳۱

نظائر بھی ایک دوسرے کی تفسیر کرتے ہیں اس ضمن میں چار بنیادی باتیں ہیں۔ ۳۲

۱۔ جب کلام میں مختلف تاویلات کا احتمال ہو تو ان میں سے جس کی نظیر قرآن میں ملے گی وہ زیادہ قابل اعتماد ہوگی۔

۲۔ نظم کلام اور حسن تاویل کے ذریعے سب سے پہلے آیت کے اجمال اور مقدر معانی کو واضح کرنا چاہیے۔ یہ چیز دونوں نظیروں میں مطابقت پر دلیل فراہم کرے گے۔ اور مجمل اور مخدوف معنی کے تعین میں دوسری دلیل بن جائے گی۔ درحقیقت جو چیز ایک جگہ مجمل یا مقدر ہوتی ہے وہ دوسری جگہ واضح اور ظاہر ہوتی ہے جیسا کہ قرآن کا عمومی اسلوب ہے۔

۳۔ جب آپ دو کلاموں کے درمیان مطابقت کو معلوم کرلو پھر سابق اور لاحق یعنی نظم کلام کو دیکھو کیونکہ ہر کلام کا ایک مناسب نظم ہوگا ہے اور یہ لازمی بات نہیں کہ دونوں نظیروں کیلئے ایک ہی نظم ہو۔ لیکن کبھی کبھار دو نظموں میں چند وجوہ سے مشابہت ہوسکتی ہے۔

۴۔ اگر ایک کلمہ یا جملہ میں دو تاویلوں کا احتمال ہو اور نظائر بھی اسی طرح محتمل ہوں۔ ایسے میں کسی ایک تاویل کی طرف جانا ٹھیک نہیں ہوگا جب تک کہ ان دونوں تاویلوں میں سے ایک راجح نہ ہو۔ ایسے میں اگر راجح تاویل کی امثلہ زیادہ ہوں گی تو کثرت نظائر دلیل بن جائے گی۔ ورنہ دونوں تاویلیں مساوی قرار پائیں گی اسکی مثال لفظ قرآن ہے۔ جو مجموع اور متلو دونوں معانی کا احتمال رکھتا ہے۔ مجموع کی طرف تاویل درست نہیں ہوگی کیونکہ جب نظائر کو اکٹھا کرکے دیکھا جائے تو ہر مقام پر متلو کا معنی صحیح بیٹھتا ہے بلکہ بعض مقامات پر وہی راجح ہوگا اور وہاں دوسرے معنی کا احتمال نہیں ہوگا۔

(iv) مخاطب پر گہری نظر ہو:

اس سے کلام کا صحیح رخ متعین ہوتا ہے۔ اور اسکا لہجہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تسلی، رافت، زجر، غضب، وعد، وعید، استدلال اور وسعت میں سے کسی پہلو پر مبنی ہے۔ [۳۳]

ب۔ اصول ترجیح:

(i) جب کلام مختلف وجوہ کا حامل ہوگا تو اس وجہ کو ترجیح دی جائے گی جو وہاں موقع اور عمود کلام سے زیادہ موافق ہوگا۔ [۳۴]

ایک کلمہ کے مختلف پہلو اور جہات ہوتی ہیں جن کی حیثیت کلمہ کے معانی کی ہوتی ہے جسطرح کہ ہر

معاملہ اور قصہ کے کئی اعتبارات ہوتے ہیں۔ جس طرح ایک مشترک لفظ کی تاویل موقع ومحل کے مطابق کی جاتی ہے لہذا یہ بھی ضروری ہے کہ ہم الفاظ اور معاملات کی تاویل ان کے موقع ومحل کے مطابق کریں مثلاً احدیت کاملہ کی صفت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے اس کے باوجود ہم اللہ تعالیٰ کا ذکر مختلف اسماء کے ساتھ اور متغائیر ترتیب پر پاتے ہیں جیسے:

(۱) (رَبِّ النَّاسِ، مَلِکِ النَّاسِ ، اِلٰـهِ النَّاسِ)۳۵

(۲) (رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ)۳۶

(الْمَلِکُ الْقُدُّوسُ السَّلاَمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ)۳۷

(۳) (الْمَلِکِ الْقُدُّوسِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ)۳۸

(۴) (الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ)۔۳۹

اسی طرح اگر موقع ومحل پر غور کیا جائے تو گہرے اشارات سے واقفیت حاصل ہوتی ہے اور اس معاملے میں ان مواقع پر کوئی التباس نہیں ہوگا۔ اسی طرح قصص واحکام کی ترتیب میں خاص اشارات نظر آئیں گے۔ حاصل بحث یہ ہے کہ کسی چیز کے اشارات واعتبارات اس کے محل سے تلاش کئے جائیں جیسا معاملہ لفظِ مشترک کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ لھذا ترجیح تاویل کا پہلا اصول یہ ہے کہ معانی کے متعدد احتمالات میں نظم فیصلہ کن ہوگا۔ ۴۰

(ii) جب کلام میں مختلف احتمالات موجود ہوں تو وہ معنی لیا جائیگا جس کی نظیر باقی قرآن میں موجود ہو اور جس معنی کی قرآن موافقت نہ کرے اسکو چھوڑ دیا جائیگا اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے((اَنَّ اللّٰـهَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ وَ اَنَّهٗٓ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ)) ۴۱ اس میں دو تاْویلات ہیں:

اول: اللہ تعالیٰ تمہارے ضمیر سے خود تم سے زیادہ واقف ہے۔

دوم: اللہ آدمی کو اس کے ارادے سے روک دیتا ہے۔

جہاں تک پہلی تاْویل کا تعلق ہے تو اس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے اور نظم اس کی تائید کرتا ہے اور یہ نظم جو تاویل کرتا ہے اس کی مشابہت قرآن میں دوسری مقامات پر موجود ہے کیونکہ نظم بھی اس بات کی تاْویل کرتا ہے جو قرآن کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتا ہے۔ اللہ کا فرمان ((تحشرون)) تقوی کے ساتھ اور تقوی اللہ کے علم کے ساتھ آتا ہے۔ گویا کہ یہاں یہ بات کہی گئی کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارے بھیدوں کو زیادہ جانتا ہے اور تم اسی کی طرف اکھٹے کئے جاؤ گے۔ یہ تاویل معنیٰ اور نظم دونوں سے مشابہت رکھتی ہے۔ جہاں تک تعلق ہے دوسری

تأ ویل کا، اس کی بنیاد لفظی مشابہت پر رکھی گئی ہے قرآن مجید میں آیا ہے ((وَ حِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ)) ۴۲ ای منعوا عن مشتھاھم۔ اگر چہ یہ بھی ایک اصل ہے لیکن یہ زیادہ کمزور ہے مذکورہ بالا دلائل کے مقابلے میں۔ کیونکہ جب لفظ مشترک مختلف معانی میں آتا ہے تو اسکا فیصلہ سیاق کلام اور صحت معنیٰ سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً لفظ امۃ کا استعمال قرآن میں اس طرح آیا ہے: ((اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ))۔ ۴۳

یہاں اس لفظ کی تاویل اس معنیٰ میں نہیں کی جائے گی جس معنیٰ میں یہ دوسرے مقامات پر آیا ہے کیونکہ وہ معانی سیاق اور صحت معنیٰ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور یہاں جو معنیٰ مراد ہے اس لفظ کی جہت سے کوئی نظیر قرآن میں نہیں ملتی۔

امۃ کا لفظ قرآن مجید کے دیگر مقامات پر زمانے کی مدت کے لئے یا لوگوں کی جماعت کے لئے یا راستے کے لئے آیا ہے لیکن جب ہم پہلی اور دوسری اصل کا سہارا لیتے ہیں تو اس لفظ کے معنیٰ واضح ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک پہلی اصل کا تعلق ہے تو اس میں لفظ قانتاً، امۃً کے بعد اس کی تفسیر ہے۔ امۃ کا معنیٰ پوری طرح فرمانبرداری ہے اور قانت سے زیادہ موافقت رکھتا ہے۔ جہاں تک دوسری اصل کا تعلق ہے تو حضرت ابراہیمؑ کی اس مکمل اطاعت کی صفت کے لئے کئی نظائر موجود ہیں۔ لیکن یہاں یہ لفظ امۃ فرمانبرداری ہی کے لئے آیا ہے۔ جمھور اھل لغت پر اس لفظ کے معنیٰ مخفی رہ گئے لیکن وہ اس کے قریب تک پہنچ گئے ہیں۔ ۴۴

(iii) جب کوئی معنیٰ ایسی عبارت کا تقاضا کرے جو کلام کا غیر ہو تو ایسے معنیٰ مرجوح ہوں گے۔ ۴۵

(iv) بہترین وجوہ کا اختیار کرنا بہترین وجوہ سے مراد یہ ہے کہ وہ بلند حقائق اور عمدہ اخلاق، دلوں کے لئے واضح، محکمات قرآنیہ کی موافقت میں ہو۔ اللہ اور اسکے رسول کے بارے میں بہترین گمان پیدا کرتی ہوں۔ اور عربی زبان کی جہت سے بیان میں زیادہ واضح ہو۔ ان بہترین وجوہ سے کی جانے والی تفسیر، تفسیر بالرائے نہیں کہلائے گی جب وہ بنیادی اصول تأ ویل کی روشنی میں کی گئی ہو۔ اور اس کو روایات پر ترجیح حاصل ہوگی کیونکہ ان میں سے اکثر میں اھل تأ ویل کی آراء ہوتی ہیں اور بسا اوقات ان پر احسن تأ ویل واضح نہیں ہوتی۔ ۴۶

(v) لفظ کی تاویل کرتے وقت لغت کے اعتبار سے ثابت شدہ معنیٰ کو ترجیح دی جائے گی۔ ایک لفظ کے جو معنیٰ کلام عرب میں اکثر استعمال ہوتے ہیں ان کو ترک نہیں کیا جائے گا اگر اس سے زیادہ قوی وجوہ موجود نہ ہوں۔

جب وہ دوسری وجوہ جیسے نظم، موافقت قرآن اور واضح عقائد کے مساوی ہو تو ضروری ہے کہ معروف معنیٰ کو اختیار کیا جائے۔ ۴۷ مثال: (فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ) میں لفظ نحر سے متعلق یہ قول کہ اس میں حکم دیا گیا ہے کہ ہاتھ کو

سینے پر باندھا جائے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں رفع یدین کا حکم ہے۔ یہ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔نماز کے ساتھ اس کی مناسبت کسی کو دھوکے میں نہ ڈالے کیونکہ یہاں پر قربانی کا حکم بہترین اور وسیع مناسبت کا حامل ہے۔ ۴۸؎

ج۔ غلط اصول:

فراھی صاحب نے غلط اصول کے ضمن میں جو بنیادی بات کی ہے وہ قرآن کی تاویل حدیث کے ذریعے ہے ان کے نزدیک معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا کہ حدیث کی صحت کو قرآن پر پرکھا جاتا۔

فراھی صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات ایسی ہیں کہ ان میں اگر تم غور کرتے ہو تو ان کے معانی کو سمجھ جاؤ گے اور کئی ایسی احادیث پاؤ گے جو اس معنی کی موافقت کرتی ہونگی لھذا حدیث نے قرآن پر کچھ بھی اضافہ نہیں کیا۔۴۹؎

اس ضمن میں علامہ نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ اگر قرآن مجید کو سمجھنے سے پہلے تم نا سمجھی سے حدیث کی طرف مائل ہو گئے تو اس میں تو صحیح اور سقیم روایات ہیں تو تمہارا دل ایسی آراء میں اٹک جائے گا کہ جس کی کوئی اصل قرآن میں نہ ہوگی اور بسا اوقات وہ قرآن کی ھدایت کے مخالف ہوگی تو یوں تم قرآن کی تأویل میں حدیث کا سھارا لوگے تو تم پر حق اور باطل خلط ملط ہو جائے گا لھذا سیدھا راستہ یہی ہے کہ تم ہدایت کو قرآن سے لو اور اس پر اپنے دین کی بنیاد رکھو اس کے بعد احادیث پر نظر دوڑاؤ اگر کوئی روایت بادی النظر میں قرآن سے ہٹی ہوئی ہو تو اس کی تأویل کلام اللہ کی روشنی میں کرو اگر دونوں میں مطابقت ہو جائے تو تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائے گی اور اگر تمہیں ناکامی ہو تو حدیث کے معاملے میں توقف کرو اور قرآن پر عمل کرو۔ ویسے بھی ہمیں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے پھر رسول ﷺ کی اطاعت کا۔۵۰؎

اور قرآن مجید کی احادیث کے ذریعے تفسیر کے بارے آپ کا موقف یہ ہے کہ احادیث کی تأویل قرآن کی روشنی میں کی جائے نہ کہ قرآن کی تاویل حدیث کی روشنی میں جو قرآن مجید کی طرح قابل اعتماد نہیں ہے۔

تفسیر بالرائے: اہل علم نے تفسیر کے جو مناھج بیان کئے ہیں وہ دو قسم کے ہیں تفسیر بالماثور اور تفسیر بالرائے:

تفسیر بالماثور وہ تفسیر ہے جو قرآن، سنت اور اقوال صحابہ کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ ۵۱؎

اور تفسیر بالرائے سے مراد اجتھاد سے کی جانے والی تفسیر ہے۔ رائے سے کی جانے والی تفسیر کی دو قسمیں ہیں: محمود اور مذموم۔۵۲؎

درجہ بندی کے اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت قرآن مجید کو دی گئی اور اسکے بعد سنت کو اور پھر صحابہ اور

تابعین کے اقوال کو۔ابن تیمیہ نے یہ سوال اٹھایا کہ تفسیر کا بہترین طریقہ کار کیا ہو پھر اس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

سب سے صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر قرآن مجید سے کی جائے۔قرآن مجید میں اگر ایک جگہ اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی تفسیر کر دی گئی ہے۔اور جہاں کہیں اختصار ہے تو دوسرے مقام پر اسکی تفصیل ملتی ہے۔اگر اس طریقے سے تفسیر نہ ہو سکے تو سنت کی طرف رجوع کرو جو قرآن مجید کی شرح و تفسیر کرتی ہے۔اور جب تفسیر قرآن وسنت سے نہ ملے تو پھر ہمیں اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے کیونکہ وہ مخصوص قرآئن و حالات کے مشاھدے کی وجہ سے قرآن کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے اور مکمل فھم اور علم صحیح کے مالک تھے۔اگر اقوال صحابہ سے بھی تفسیر نہ ہو سکے تو پھر اقوالِ تابعین کی طرف رجوع کیا جائے گا۔لیکن جب تابعین کا کسی شے پر اجماع ہو تو بلاشبہ وہ حجت ہے ہاں جب ان میں اختلاف واقع ہو تو ایک تابعی کا قول نہ تو دوسرے تابعی پر حجت ہوگا اور نہ ہی بعد والوں پر۔ایسی صورت میں قرآن وسنت کی زبان، عام لغت عرب کو یا اقوال صحابہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔لیکن مجرد رائے سے تفسیر کرنا حرام ہے۔۵۳

فراہی صاحب کے اصولوں کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آپ تفسیر بالرائے کے قائل ہیں۔قرآن مجید میں گہرے تفکر و تدبر کو بنیادی اہمیت دیتے ہیں لیکن تفسیر قرآن کے ضمن میں بیان کی گئی تأویلات کی کثرت کو قرآن کے صحیح فھم میں رکاوٹ اور حجاب سمجھتے ہیں جب تک کہ ان میں سے ایک تأویل کو ترجیح نہ دی جائے کیونکہ فراہی صاحب کے نزدیک قرآن قطعی الدلالۃ ہے۔

مقدمہ میں آپ نے لکھا ہے قرآن مجید بالکل قطعی الدلالۃ ہے ہر آیت میں مختلف معانی کا احتمال محض ہمارے قلت علم و تدبر کا نتیجہ ہے۔۵۴

لہٰذا آپ کے نزدیک قرآن مجید کی تأویلات ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی ہیں یہی وہ وجہ ہے کہ آپ نے سلف صالحین میں سے امام طبری، امام زمخشری اور امام رازی پر تنقید کی ہے جنہوں نے نہ تو روایات کی صحت کا التزام کیا اور نہ ہی کسی ایک تاویل کے بیان پر اکتفا کیا بلکہ آیات کے ضمن میں بہت سے اقوال نقل کر دیئے۔حالانکہ قرآن قطعی الدلالۃ ہے اور اس کی ایک ہی تأویل ہو سکتی ہے۔

اس جان لیوا مرض کی کوئی دواء نہیں ہے سوائے اس کے کہ قرآن کو مضبوطی سے پکڑا جائے اور روایات اور مختلف آراء کو کتاب اللہ کی طرف لوٹایا جائے۔اور ایسا نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہمارا اس بات پر ایمان نہ ہو کہ قرآن کی کسی آیت کی بس ایک ہی تاویل ہو سکتی ہے۔۵۵

علامہ فراہی نے تفسیر قرآن میں صرف قرآن کو اصل قرار دیا اور باقی علوم کو فرع یا محض تائید کرنے والے علوم کی حیثیت دی ہے۔ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس امر کی وضاحت کی ہے۔

بعض ماخذ اصل واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور بعض فرع کی۔ اصل واساس کی حیثیت تو صرف قرآن کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی چیز کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ باقی فرع کی حیثیت سے تین ہیں: ۱۔ احادیث، ۲۔ قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات، ۳۔ گزشتہ انبیاء کے صحیفے جو محفوظ ہیں۔ اگر احادیث، تاریخ اور قدیم صحیفوں میں ظن اور شبہ کا دخل نہ ہوتا تو ہم ان کو فرع کے درجہ میں نہ رکھتے بلکہ سب کی حیثیت اصل کی قرار پاتی سب بلا اختلاف ایک دوسرے کی تائید کرتے۔ ۵٦

فراہی صاحب کے اصول تاویل کو خصوصیت کے ساتھ انہیں کے اقتباسات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب التکمیل میں کئی دیگر نکات بھی شامل بحث ہیں جن کی حیثیت جزئیات کی ہے اور وہ سب کسی نہ کسی حوالے سے اصول تاویل کے دائرہ میں سمٹ جاتے ہیں جیسے قرآن مجید کی تفسیر قرآن سے، نظم کلام کی رعایت، کلام کے عموم وخصوص کا فہم، وجوہ قرآن اور اسکے تحت مشترک اور جامع کی بحث، الفاظ ومعانی کے مختلف پہلو، حذف اور قرین وغیرہ۔ کم وبیش یہ سارے وہ مباحث ہیں جو کتب علوم القرآن اور کتب اصول میں بھی زیر بحث لائے جا چکے ہیں لیکن سب سے بڑا اور نمایاں فرق یہ ہے کہ علامہ فراہی نے ان تمام طرق کو نظم کے مرکزی اصول کی روشنی میں تاویل واحد کی غرض سے بیان کیا۔

فراہی صاحب کی فکر کا خلاصہ:

فراہی صاحب کی خصوصی دلچسپی کا موضوع علوم القرآن اور اس فن پر آپ نے کئی کتب تالیف کیں جن میں کئی کتب ایسی ہیں جنہیں تفسیر قرآن کا مقدمہ کہا جا سکتا ہے اور خود آپ نے وہ کتابیں اپنی تفسیر کے مقدمہ کے غرض سے ہی تالیف کیں البتہ جہاں تک کتاب التکمیل کا تعلق ہے اس کتاب میں نظم قرآن کو مرکزی اصول تاویل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جبکہ اسی اصول کو مرکز اور بنیاد مان کر دیگر کئی اصول وفروعات کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ تفسیر قرآن کے ضمن میں جو تفصیلات آپ سے منقول ہیں ان سب میں نظم قرآن ہی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ آپکی دیگر کتب اور مذکورہ کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فراہی صاحب کو اس حوالہ سے گہری تشویش تھی کہ قرآن مجید کی تفسیر میں اقوال کی کثرت پائی جاتی ہے جو امت میں انتشار کا بنیادی سبب ہے صحابہ کرامؓ کے طبقہ کے بعد قرآن مجید کے تفسیری اصول وضع نہیں کئے گئے جن کو تبیین کتاب میں مرکزی حیثیت حاصل ہوتی۔ صحابہ کرامؓ

کا طبقہ تو قرآن کے نظام سے واقف تھا جو الحمد سے والناس تک پایا جاتا ہے لیکن بعد میں اس نظام کو جاننے کے کوئی ایسے اصول وضع نہیں کئے گئے جو فہم قرآن میں میزان کی حیثیت رکھتے اور اسی میزان یعنی اصول تاویل پر تفسیر قرآن میں ہر منقول کو پرکھا اور جانچا جاتا۔ اس ضمن میں اگرچہ بعض مفسرین نے کوشش کی لیکن اس کام میں جس قدر محنت اور مشقت مطلوب تھی اسقدر توجہ کوئی نہیں دے سکا۔ نتیجۃً کتاب اللہ کے اندر من مانی تاویلات کی جرأت کی جاتی رہی اور کوئی بھی تفسیر، اقوال کی کثرت جو کسی بھی طرح فہم قرآن کی بنیاد نہیں بن سکتے، سے محفوظ نہ رہی۔ شدت سے اس امر کی ضرورت تھی کہ قرآن مجید میں غور وفکر اور گہرے تدبر سے اس کا نظام متعین کیا جائے اور سورتوں کے مرکزی مضمون یعنی انکا عمود مقرر کر کے اس کے گرد رہ کر ساری سورت کی تفسیر کی جائے اس ضمن میں جس قدر مروی روایات اور اقوال ملیں انکو اسی کسوٹی پر پرکھا جائے تا کہ قرآن مجید کی ایک ایسی تفسیر سامنے آئے جو اقوال اور تاویلات کی کثرت سے مامون ہو۔

قرآن مجید چونکہ قطعی الثبوت ہونے کے ساتھ قطعی الدلالہ بھی ہے لہذا یہ جائز نہیں کہ قرآن میں اس قدر تاویلات کو آیات کی تفسیر میں بیان کیا جائے جس سے قرآن کے اصلی مطالب اخفا میں رہ جائیں اور اللہ کی مراد نکھر کر سامنے نہ آسکے۔ لہذا قرآن مجید کی تفسیر میں آیات کی ایسی تاویل کی جائے کہ دوسری کسی تاویل کی گنجائش نہ رہے۔ ایسا صرف اس صورت میں ممکن ہے جب ہر سورت کا عمود نکالا جائے پھر اس عمود کو مرکز مان کر سورت کی تفسیر کی جائے۔ تفسیر قرآن کا منہج کچھ اس طرح ہوگا کہ سب سے پہلے سورتوں کے نظام پر غور وفکر کیا جائے گا پھر سورتوں کے عمود کے تحت آیات کی حتمی جامع اور مانع تاویل کی جائے گی۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے سب سے پہلے قرآن مجید کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے گی اس کے بعد حدیث سے اگر وہ مرکزی مضمون یعنی نظم میں بگاڑ کا سبب نہ بنے بلکہ اس کی تائید کرنے والی ہو کیونکہ حدیث کی بنیاد پر قرآن کو نہیں پرکھا جائے گا بلکہ قرآن سے حدیث کی صحت کا ثبوت معلوم ہوگا کیونکہ متواتر روایات تو بہت کم ہیں۔ تفسیر کے ضمن میں چونکہ اخبار احاد ہی منقول ہیں جن کی حیثیت محض ظن کی ہے لہذا اسے ظنی ماخذ کے طور پر دیکھا جائے گا۔ اسی کے ساتھ دیگر ظنی ماخذوں میں جن کی حیثیت فرع کی ہے سابقہ آسمانی صحیفے اور قوموں کے ثابت شدہ اور متفق علیہ حالات شامل ہیں لیکن اصل کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہوگی۔

فراہی صاحب کی فکر کا تنقیدی جائزہ:

اصول تفسیر کے حوالہ سے سلف صالحین کی خدمات کا جائزہ لیں تو فراہی صاحب کی بات درست معلوم نہیں ہوتی بلکہ مبالغہ پر مبنی محسوس ہوتی ہے کہ اصول تفسیر کی طرف مسلمانوں نے وہ توجہ نہیں دی جس قدر توجہ کا یہ علم مستحق تھا۔

قرآن مجید کے تفسیری اصولوں کو جس انداز میں زیر بحث لایا گیا اس کی کل چار نمایاں صورتیں بنتی ہیں:

☆ کتب اصول فقہ

☆ کتب علوم القرآن

☆ کتب تفاسیر کے مقدمات

☆ کتب اصول تفسیر

کتب اصول فقہ:

علماء اصول کا اس امت پر احسان ہے کہ انہوں نے انتہائی دقیق نظری سے اصول وضع کئے۔ ہر اصول کی کتاب میں قرآن مجید سے اسکے بنیادی ماخذ ہونے کے حیثیت سے بحث کی گئی اور اس فن میں وہ اصول بیان کئے گئے جن سے فہم قرآن میں مدد ملی۔ ان میں سے وہ اصولیین بھی ہیں جنہوں نے اصول پر کتب تالیف کرنے کے ساتھ ساتھ کتب تفاسیر کا بھی ایک یادگار ذخیرہ چھوڑا جیسے امام جصاص، امام رازی اور امام نسفی وغیرہ۔ نظم کے معانی کے تعلق کے حوالے سے نظم کی جو مختلف اقسام بن سکتی ہیں انکو بھی انہیں کتب اصول فقہ میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا۔

کتب علوم القرآن:

کتب علوم القرآن میں بھی خصوصیت کے ساتھ قرآن مجید کے تفسیری اصول بیان کئے جاتے رہے۔ اسی ضمن میں سب سے اہم کتب علامہ بدر الدین زرکشی کی البرھان فی علوم القرآن اور جلال الدین سیوطیؒ کی الاتقان فی علوم القرآن ہیں۔

کتب تفاسیر کے مقدمات:

قرآن مجید کے تفسیری اصولوں کا ایک ماخذ وہ کتب تفاسیر ہیں جن کے مقدمات میں ان اصولوں کو مختلف انداز میں زیر بحث لایا گیا جیسے ابن جریر طبری کی تفسیر جامع البیان عن تاویل آی القرآن، امام راغب اصفہانی کا مقدمۃ التفسیر، ابن عطیہ اندلسی کی تفسیر المحرر الوجیز اور امام قرطبی کی تفسیر الجامع لاحکام القرآن وغیرہ۔

کتب اصول تفسیر:

اصول تفسیر پر لکھی گئی مستقل کتب جیسے ابن تیمیہ کا مقدمہ فی اصول التفسیر اور شاہ ولی اللہؒ کی الفوز الکبیر فی اصول التفسیر وغیرہ۔

قرآن مجید کے تفسیری اصول زیادہ اہتمام کے ساتھ کتب علوم القرآن اور اصول فقہ میں بیان کئے گئے۔علامہ فراہی نے اس کتاب میں تاویل کے مختلف اصول پیش کر کے معانی قرآن کی تفہیم کے طرق واضح کئے ہیں اور آپ نے ان مشکلات کی بھی نشاندہی کی جو تفسیر کے میدان میں مفسر کو پیش آتی ہیں۔اصول تاویل کے حوالے سے آپکا نقطہ نظر جمہور سے بالکل مختلف اور منفرد ہے۔

لیکن عملی طور پر تاویل واحد کا جو نظریہ علامہ فراہی نے دیا اس سے اختلاف کی صورتیں جلد ہی ان کے شاگرد امین احسن اصلاحی کی تفسیر میں نظر آئیں۔مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت:

(يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ) ۵۷

مولانا اصلاحی صاحب نے اس آیت کے تحت علامہ فراہی کی تاویل نقل کی ہے:

''مولانا فراہی اس آیت کو ذرا اس سے مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ان کی تاویل یہ ہے کہ چونکہ یہ انفاق اس جہاد کے لیے تھا جس کا حکم خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے ہوا تھا اس وجہ سے اس نے مسلمانوں کی ساری توجہ اپنی طرف جذب کر لی اور اس جہاد کی تیاریوں میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ انفاق کے دوسرے مصارف والدین، اقربا، یتامیٰ، مساکین وغیرہ کی طرف ان کو وہ توجہ نہیں رہی جو ہونی چاہیے تھی اس وجہ سے لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی مقدار کیا ہو۔اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے اس کے اول حق دار وہ مستحقین ہیں جن کا ذکر ہوا، پھر مزید جو کچھ خرچ کیا جائے تو وہ سب اللہ کے علم میں

رہے گا۔ اور وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یہاں مقدار کی تشریح نہیں فرمائی کہ لوگ خود اپنی عقل سے کام لیں اور مختلف دینی ضروریات میں توازن قائم کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی بعض لوگوں کے ذہن میں مقدار سے متعلق شبہ رہ گیا تو انہوں نے پھر سوال کیا۔ ان کے جواب میں یہ تصریح کر دی گئی کہ جو کچھ مستحقین سے فاضل بچے وہ خرچ کرو، چونکہ اوپر مستحقین کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے یہ مختصر جواب کافی ہوا'' ۵۸؎

امین احسن اصلاحی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس سورہ میں شروع ہی سے انفاق اور زکوٰۃ کا حکم بار بار آ رہا ہے۔ خاص طور پر آیت ۹۵ میں بیت اللہ کی آزادی کے جہاد کے سلسلے میں بڑی تاکید سے انفاق پر ابھارا ہے۔ وہاں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے تو خطاب عام ہے لیکن روئے سخن درحقیقت ان مسلمانوں کی طرف ہے جو جان و مال کی قربانی میں کمزور تھے قاعدہ ہے کہ آدمی کے دل میں اگر کسی چیز سے متعلق کمزوری ہو، وہ اس کے کرنے کی ہمت نہ کر رہا ہو تو وہ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لیے بار بار سوال کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جہاں تک اصل کام کا تعلق ہے اس کو کرنے کے لیے تو وہ جی جان سے حاضر ہے لیکن کرے کیا کہ ابھی تو اصل بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ یہی بھید ہے کہ سوالات سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے بہت کم کئے گئے۔ زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے کیے گئے جو کم ہمت اور بخیل تھے اور اپنی اس کمزوری کو سوالات کے پردے میں چھپانا چاہتے تھے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جنہوں نے انفاق کے حکم کے جواب میں یہ سوال اٹھایا جس کا آیت زیر بحث میں حوالہ دے کر جواب دیا گیا ہے۔ اس سوال سے خود اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ گویا وہ انفاق کے مطالبوں سے دبے جا رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ مطالبے کس حد پر جا کر رکیں گے۔ چنانچہ قرآن نے سوال کرنے والوں کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر جواب دیا ہے اور اس جواب کے دو حصے ہیں۔'' ۵۹؎

جلیل احسن ندوی صاحب نے اصلاحی صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس کے بقیہ حصہ کا خلاصہ بیان کرنے کے بعد تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا اصلاحی صاحب کا اقتباس لمبا ہے نقل میں طوالت ہوگی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جواب کا پہلا حصہ یہ ہے کہ انفاق کا فائدہ تمہارے معاشرے کے افراد ہی کو پہنچے گا خدا کو نہیں۔ وہ تمہارے مال کا محتاج نہیں ہے۔ اور جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انفاق کرو گے تو اس کا بھرپور صلہ ملے گا۔ مولانا فرماتے ہیں کو پھر بھی اس طرح کے لوگ سوال کرتے رہے تب اللہ نے فرمایا کو جو ضروریات سے بچ رہے وہ اعلائے کلمۃ اللہ کی مہم میں لگاؤ۔ یہاں یہ

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اپنے شیخ کی رائے کیوں نہیں قبول کی۔ اپنی رائے کے بالمقابل ان کی رائے پیش کرنے پر کیوں اکتفا فرمایا؟ بہت سے دوسرے مقامات پر حضرت شیخ کی رائے سے اختلاف کیا ہے تو اختلاف کے دلائل بھی دیے ہیں، یہاں کیوں نہیں دیے؟ تا کہ قرآن کے طلبہ یہ جان سکتے کہ مولانا کے دلائل میں کتنا وزن ہے اور مولانا فراہی کی رائے کیوں قابل قبول نہیں ہے۔''

یہاں پر مولانا فراہیؒ کی رائے پیش کرتے ہوئے صاحب تدبر نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

''مولانا فراہیؒ اس آیت کوذرا اس سے مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں''

''حالانکہ دونوں کا زاویہ نظر مختلف ہے۔ ''ذرا'' مختلف نہیں ہے۔ مولانا فراہیؒ کے نزدیک اس آیت میں ان سچے اور پکے اور اونچے اہل ایمان کا اعلیٰ کردار پیش کیا گیا ہے جو سراپا سوال بنے ہوئے ہیں کہ کتنا انفاق کریں جو اعلائے کلمۃ اللہ کی مہم میں ضروری ہے۔ اور پوچھ وہ رہے ہیں جو اس مہم کے لئے پورا انفاق کر رہے ہیں۔ اتنا انفاق کر رہے ہیں کہ اندیشہ ہو چلا ہے کہ والدین، قرابت مندوں اور محتاجوں کے حقوق پس پشت نہ ڈال دیں۔ اس لئے خدا نے انفاق میں توازن کی تعلیم دی۔ اس کے بالکل برعکس مولانا اصلاحی صاحب ''کچے اور بخیل'' لوگوں کا کردار پیش کر رہے ہیں حالانکہ یہاں سیاق وسباق میں دور دور تک کہیں ان کچے لوگوں کا ذکر نہیں ہے۔''[٦٠]

اصول نظم کا تقاضا تو یہ تھا کہ ایک تاویل سامنے آتی لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دونوں مفسرین' علامہ فراہی اور ان کے شاگرد امین احسن اصلاحی کی مذکورہ بالا آیت کے تحت دی گئی تاویلات بالکل مختلف ہیں۔ اسی طرح اگر نظم کی روشنی میں ہی تاویل کئے جانے کو حتمی مان بھی لیا جائے تو تیسری اور چوتھی تاویل کئے جانے کا احتمال بھی خارج از امکان نہیں۔ علاوہ ازیں دونوں مفسرین کی طرف سے کی جانے والی تاویل روایات میں بیان کئے گئے اس شان نزول سے بالکل مختلف ہے جس کی روشنی میں اکثر مفسرین نے آیت مذکورہ کی تفسیر بیان کی۔ شان نزول کی روشنی میں کی جانے والی تفسیر سے جو صحت سے زیادہ قریب ہے سے ہٹنے کی کوئی وجہ اور ٹھوس دلیل بھی مذکورہ بالا دونوں تاویلات کے بیان میں پیش نہیں کی گئی۔ دونوں تاویلات کا ماخذ ایسا گمان ہے جس سے آیت کے مطلب میں مزید الجھاؤ پیدا ہوا ہے۔

فراہی صاحب نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں احادیث کو ایک کمزور ماخذ کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ بخاری اور مسلم کی احادیث پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یاد رکھنا چاہیئے کہ اکثر اہل حدیث کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ بخاری اور مسلم میں جو کچھ روایت

ہو گیا ہے اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ ہم یہاں بعض وہ چیزیں بیان کرتے ہیں جو ان دونوں کتابوں میں موجود ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ قاری جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کے رب بنا لینے کو گناہ کا کام بتایا ہے لہٰذا ہم ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتے جو انہوں نے بے سوچے سمجھے اختیار کر لی ہیں:

امام بخاری، امام مسلم (علیہما الرحمۃ) دونوں نے حضرت ابوذرؓ سے ایک روایت یوں نقل کی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے آیت ''والشمس تجری لمستقرلھا ''(یٰسین ۳۶:۳۸) (اور سورج اپنے ایک متعین مدار پر گردش کرتا ہے) کے بابت سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ سورج کا مستقر عرش کے نیچے ہے۔ ۶۱

دوسری روایت ابوذرؓ ہی سے انہوں نے یوں بیان کی ہے کہ میں نبی ﷺ کے ساتھ غروب آفتاب کے وقت مسجد میں تھا۔ آپؐ نے پوچھا: ابوذر! جانتے ہو سورج کہاں غروب ہوتا ہے؟ میں نے جواب دیا: اللہ اور اسکا رسولؐ زیادہ جانتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: وہ جاتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے سجدہ میں پڑ جاتا ہے۔ آیت ((والشمس تجری لمستقرلھا)) کا یہی مفہوم ہے۔ ۶۲، ۶۳

فراہی صاحب کے احادیث کے بارے اس رویے پر سید مودودی نے تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک جگہ مصنف نے احادیث کی کمزوری ثابت کرتے ہوئے چند مثالیں پیش کی ہیں جن میں ایک وہ حدیث بھی ہے جو بخاری و مسلم نے ((والشمس تجری لمستقرلھا)) (سورج اپنے مستقر کی طرف چلا جا رہا ہے) کی تفسیر میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے نقل کی ہے۔ مستقرھا تحت العرش (سورج کا مستقر عرش کے نیچے ہے) اور فانھا تذھب حتیٰ تسجد تحت العرش (اور وہ جا رہا ہے تا کہ عرش کے نیچے سجدہ کرے) مصنف نے اس حدیث کو ایسا بدیہی البطلان سمجھا کہ اس کو باطل ثابت کرنے کے لئے دلائل پیش کرنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی لیکن اس قسم کا حکم لگانے مین انہوں نے ویسی ہی غلطی کی ہے جیسی ان سے پہلے کے بہت سے لوگ کر چکے ہیں۔ اپنے عہد کی معلومات پر بسا اوقات انسان اتنا زیادہ بھروسہ کرنے لگتا ہے کہ گویا وہ علم کی آخری حد کو پہنچ چکا ہے، اور اسی مبالغہ آمیز اعتماد کی وجہ سے وہ اکثر ان چیزوں کو بے تکلف غلط بلکہ بدیہی البطلان قرار دے بیٹھتا ہے جو اس کے وقتی علم کے خلاف ہوتی ہیں۔ حدیث کے معاملہ میں تو ایسے احکام لگا دینے کی جرأت زیادہ آسان ہے کیونکہ راویوں کو جھوٹا قرار دے دینا کونسا مشکل کام ہے؟ رہا قرآن تو جو لوگ ایمان سے محروم ہیں وہ اس کو بھی نعوذ باللہ مہمل کہنے میں تأمل نہیں کرتے۔ البتہ اہل ایمان کو جب وہاں کوئی ایسی چیز نظر آ جاتی ہے تو وہ کچھ دیر کسمسانے کے بعد آخر کار عجیب تاویلیں کرنے لگتے ہیں حالانکہ اگر علم انسان کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو ایسے مواقع پر قطعیت کے ساتھ حکم لگا دینے کی جرأت

مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔''

''فلکیات سے متعلق کچھ مدت پہلے تک انسان کا علم اس قدر محدود تھا کہ وہ اپنے نظام شمسی ہی کو کائنات سمجھتا تھا اور اس کا خیال تھا کہ اس کائنات کا مرکزی نقطہ سورج ہے جو اپنی جگہ قائم ہے۔ اس علم پر اس کو اتنا وثوق تھا کہ والشّمس تجری (سورج چل رہا ہے) کی حقیقت ہی اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ وہ تجری لمستقر لھا (اپنے مستقر کی طرف جا رہا ہے) کو سمجھ سکتا۔ اسی بنا پر لوگ اس آیت کی تأویل میں ٹھوکریں کھایا کرتے تھے، اور بعض کم فہم اس سے یہ نتیجہ بھی نکال بیٹھتے تھے کہ یہ خدا کا نہیں بلکہ ایک اُمّی عرب کا کلام ہے (نعوذ باللہ)۔ لیکن اب فلکیات کے جدید مشاہدوں سے یہ حقیقت منکشف ہو رہی ہے کہ سورج اپنے پورے نظام کو لئے ہوئے کسی طرف جا رہا ہے، اور اس نظام شمسی کے علاوہ بے شمار دوسرے نظامات بھی ہیں جن کے مرکز اپنے متعلقین کو لئے اسی طرح فضائے بسیط میں حرکت کر رہے ہیں۔ جن ستاروں کو اب تک ثوابت سمجھا جاتا تھا، قریب قریب وہ سب کے سب متحرک پائے گئے ہیں اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۱۰ میل سے ۱۰۰ میل فی سیکنڈ تک کی رفتار سے وہ اپنی جگہ چھوڑ رہے ہیں۔ اب صرف یہ امر پردۂ خفا میں رہ گیا ہے کہ وہ ''مستقر'' کونسا ہے۔ جس کی طرف یہ مختلف نظامات فلکی کے مرکز رواں دواں ہیں؟ اس سوال کو انسان ابتک حل نہیں کر سکا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک اسے کائنات کے مرکز کا پتہ نہیں چل سکا۔۔۔''

''پس یہ ایک بڑی غلطی ہے جس پر لوگوں کو متنبّہ ہو جانا چاہیے کہ انسان اپنے وقت کی معلومات کو حتمی و یقینی سمجھ لے اور ان کے خلاف جب کوئی حدیث یا آیت قرآنی نظر آئے تو اس کو مہمل قرار دینے لگے۔ انسان پر حقائق کا علم آہستہ آہستہ منکشف ہو رہا ہے اور اس ترقی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمات خود ہی غیر مسلم ہوتے جاتے ہیں جن کی بنیاد پر احادیث اور آیات میں غلطیاں نکالنے کی جرأت کی جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ احادیث میں ضعیف اور موضوع روایتیں نہیں ہیں۔ ہیں اور ضرور ہیں مگر جن حدیثوں کی سند قوی ہو ان کے معاملہ میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔''[۶۴]

اس طرح تدبر قرآن میں سورہ علق کی مثال بھی دیکھی جا سکتی ہے جہاں امین احسن اصلاحی صاحب نے ان روایات کو چھوڑ کر جو صحیحین میں روایت کی گئیں جن میں سورہ علق کی پہلی پانچ آیات کے نزول کا بیان ہے۔ آپ نے اس کو مشہور قول ماننے کے باوجود یہ لکھا ہے:

''میرے نزدیک یہ پوری سورہ بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہے۔ اس کی ابتدائی پانچ آیتوں کا مزاج بھی

بعد کی آیتوں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔سورہ کا انداز خطاب وکلام اتنا تیز وتند ہے کہ بالکل پہلی ہی سورہ میں یہ انداز سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں اختیار فرمایا گیا۔علاوہ ازیں سورہ کے الفاظ میں کوئی قرینہ یا اشارہ ایسا موجود نہیں ہے جس سے اس کا دو الگ الگ قسطوں میں نازل ہونا معلوم ہوتا ہو۔''٦٥

فراہی صاحب کا نظریہ کہ تفسیر قرآن میں نظم قرآن کو اصل الاصول کی حیثیت حاصل ہے کئی وجوہ سے درست نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کے لئے صحیح روایات کو اس نظم پر مقدم رکھنا چاہئے جو محض عقل انسانی کے غور وفکر کا نتیجہ ہے جس میں خطا کا امکان موجود ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن میں ایسے تدبر وتفکر سے جو نتائج سامنے آئیں وہ درست نہ ہوں،مفسر پر اس کی غلطی بھی واضح نہ ہو تو وہ ایسے نتائج سے بننے والی رائے کے مقابلے میں صحت کی شرائط پر پورا اترنے والی روایات کو چھوڑنے کی غیر معمولی غلطی کر بیٹھے۔اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک مفسر قرآن میں غور وفکر سے جو نظم متعین کرتا ہے اس کی حیثیت قطعی نہیں بلکہ اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ممکن ہے کوئی دوسرا مفسر عربی زبان میں مہارت رکھنے کی وجہ سے قرآن میں غور وفکر کر کے دوسرا نظم متعین کر دے اور روایات کے رد وقبول کا معیار اس کا اپنا نظم ہو اس لئے یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ نظم کا تعین منصوص نہیں بلکہ انسانی کوشش ہے جس میں غلطی کا امکان موجود ہے اس لئے قرآن میں غور وفکر کے باوجود روایات سے مدد لینا ضروری ہے۔

حوالہ جات وحواشی

1۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ ضلع اعظم گڑھ (یو۔پی۔بھارت) کے ایک گاؤں پھریہا میں ۱۲۸۰ھ مطابق 1861ء میں پیدا ہوئے۔مولانا کا خاندان ضلع کے معزز خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اور تعلیم اور دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے پہلے سے ممتاز رہا ہے۔مولانا حمید الدین،مولانا شبلی نعمانیؒ کے ماموں زاد بھائی تھے۔مختلف زبانوں میں آپ کو مہارت حاصل تھی۔زندگی کے آخری عرصہ میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا انتظام سنبھالا۔اس کا نصاب جدید خطوط پر مرتب کیا اور مدرسہ کے امور کی نگرانی کرتے رہے اس کے ساتھ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے علمی معاملات میں بھی برابر دلچسپی لیتے رہے۔آخر عمر میں بیمار ہو گئے اور متھرا چلے گئے،وہیں ۱۹ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ مطابق 11 نومبر 1930ء کو انتقال فرمایا اور اسی شہر میں آپ کو دفن کیا گیا۔آپ کئی کتب کے مولف تھے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان، فاتحہ نظام القرآن، مفردات القرآن، الامعان فی اقسام القرآن، تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان، دلائل النظام، اسالیب القرآن اور التکمیل فی اصول التاویل وغیرہ

[اصلاحیؒ، امین احسن، مصنف (علامہ فراہیؒ) کے مختصر حالات زندگی، در کتاب ''مجموعہ تفاسیر فراہیؒ''، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، مئی ۲۰۰۸، ص ۷۔۲۴

اصلاحیؒ، ظفر الاسلام، مولانا حمید الدین، در مجموعہ مقالات علامہ حمید الدین فراہیؒ؛ حیات و افکار، اعظم گڑھ، انڈیا، مدرسۃ الاصلاح، ۱۹۹۲ء، ص ۳۷۔۵۴]

2۔ فراہیؒ، التکمیل فی اصول التاویل، در رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن، اعظم گڑھ، الہند، الدائرۃ الحمیدیہ، ۲۰۰۵م، ص ۲۰۹

3۔ ایضاً، ص ۲۱۰

4۔ ایضاً، ص ۲۱۱

5۔ ایضاً

6۔ ایضاً، ص ۲۱۳

7۔ ایضاً، ص ۲۱۴

8۔ ایضاً، ص ۲۲۳

9۔ فراہیؒ، تفسیر قرآن کے اصول، ترتیب و ترجمہ: خالد مسعود، لاہور، ادارہ تدبر قرآن و حدیث، ۱۹۹۹ء، ص ۵۸

10۔ ایضاً

11۔ ایضاً، ص ۱۰۶

12۔ ایضاً، ۱۰۷

13۔ فراہیؒ، مقدمہ تفسیر نظام القرآن، مترجم: امین احسن اصلاحی، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۷۔۲۴

14۔ ایضاً، ص ۴۵۱

15۔ التکمیل، ص ۲۲۵

16۔ ایضاً

17۔ ایضاً، ص ۲۲

18۔ فراہی صاحب کے ہاں یہی اصل الاصول ہے۔

19۔ احزاب ۳۳:۳۳

20۔ التکمیل، ص ۲۶۲

21۔ ایضاً، ص ۲۶۳

22۔ التحریم ۶۶:۴

23۔ التکمیل، ص ۲۶۳

24۔ یونس ۱۰:۹۲

25۔ التکمیل، ص ۲۷۴

26۔ ایضاً، ص ۲۶۳

27۔ ایضاً

28۔ الانفال ۸:۷۲

29۔ الانفال ۸:۷۴

30۔ الانفال ۸:۷۵

31۔ التکمیل، ص ۲۶۳

32۔ ایضاً، ص ۲۶۴، ۲۶۵

33۔ ایضاً، ص ۲۶۷

34۔ ایضاً

35۔ الناس ۱۱۴:۳۔۱۱

36۔ فاتحہ ۱:۱۔۳

37۔ الحشر ۵۹:۳

38۔ الجمعہ ۶۲:۱

39۔ الملک ۶۷:۲

40۔ التکمیل، ص ۲۶۷، ۲۶۸

41۔ انفال ۸:۲۴

42۔ سبا ۳۴:۵۴

43۔ النحل ۱۶:۱۲۰

44۔ التکمیل، ص ۲۶۸، ۲۶۹

45۔ ایضاً

46۔ ایضاً، ص ۲۷۰

47۔ ایضاً، ص ۲۷۲

48۔ ایضاً، ص ۲۷۳

49۔ ایضاً، ص ۲۷۵

50۔ ایضاً

51۔ زرقانی، عبدالعظیم، مناہل العرفان فی علوم القرآن، بیروت، احیاء تراث العربی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۴۰
52۔ ایضاً، ص ۳۶۶
53۔ ابن تیمیہؒ، مقدمہ فی اصول التفسیر، لاہور، المکتبۃ العلمیہ، س۔ن، ص ۲۹۔۳۵
54۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۴۴
55۔ التکمیل، ص ۲۳۰
56۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۳۷
57۔ البقرۃ ۲:۲۱۵
58۔ اصلاحیؒ، امین احسن، تدبر قرآن، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، نومبر ۲۰۰۱ء ۵۱۰/۱ (فراہی صاحب کا یہ قول ان کی تعلیقات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ فراہیؒ، تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم، اعظم گڑھ، الہند، الدائرۃ الحمیدیہ، ۲۰۱۰ء، ۶۹/۱)
59۔ تدبر قرآن، ۵۰۹/۱
60۔ ندوی، جلیل احسن، تدبر قرآن پر ایک نظر، لاہور، دار التذکیر، ۲۰۰۷ء، ص ۶۶۔۶۷
61۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب التوحید، باب قولہ تعالیٰ: تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ اِلَيْهِ ؛ مسلم، الجامع الصحیح، کتاب الایمان، باب بیان الزمن الذی لا یقبل فیہ الایمان
62۔ بخاری، الجامع الصحیح، کتاب التفسیر، باب قولہ والشمس تجری لمستقر لها ذالك تقدير العزيز العليم
63۔ مقدمہ تفسیر نظام القرآن، ص ۶۵
64۔ خورشید احمد، ادبیات مودودی، لاہور، اسلامک پبلی کیشنز لیمیٹڈ، ۱۹۸۵ء، ص ۳۴۸۔۳۵۱
65۔ تدبر قرآن، ۴۵۹/۹۔۴۶۰